ادب کے معاملہ میں بھی ابھی صرف اردو ادب سے بیزار ہوئے تھے۔ مغربی ادب اور فلسفہ کے رد کی نوبت ابھی نہیں آئی تھی۔ اس وقت تو ان کے یہاں کیمرے اور ایذرا پاؤنڈ رکا دور چل رہا تھا۔

ہاں وہ ادبی کنونشن کی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے شہر و دیہات سے جو اتنے بہت سے معروف، نیم معروف، غیر معروف ادیب، نیم ادیب، غیر ادیب اکٹھے ہوئے تھے ان کی بحثوں سے پیدا کیا ہوا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ پیدا ہوا۔ اگرچہ پیدائش آسانی سے نہیں ہوئی۔ ایسی گھڑی بھی آئی کہ جمیل الدین عالی تقریر کرتے کرتے بے ہوش ہو گئے۔ بہرحال رائٹرز گلڈ عالم وجود میں آ گیا اور یہ کہ

''شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر بن گیا۔''

جمیل الدین عالی ادیبوں کے ڈپٹی کلکٹر بن گئے۔

ادیب سمجھے کہ اب ان کے دن پھر جائیں گے۔ محرومی کے دن گئے۔ مرادیں پوری ہوں گی۔ ہوائی بات نہیں کرتا۔ عالی سے سنی کہتا ہوں۔ کیا بزرگ کیا جوان، کیا معروف کیا غیر معروف، ہر طرح کے ادیبوں نے اپنے حساب سے ادب کی، زبان کی، قوم کی جو خدمات انجام دی تھیں اس کا احوال لکھ لکھ کر گلڈ کے دفتر میں بھیجنا شروع کیا

''لکھتے نامہ لکھے گئے دفتر''

ویسے قسمت والوں کی مرادیں پوری بھی ہوئیں۔ کتنوں کے دن واقعی پھر گئے۔ فیض، بہتوں کو پہنچا، کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ آدم جی انعام تو خیر اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ بن کر رہ گیا۔ پہلے مرحلے میں یہ انعام دو ہی لکھنے والے حاصل کر سکے۔ غلام عباس اور شوکت صدیقی۔ محرومین کو شور مچانا ہی تھا، سو مچایا۔ بہرحال مدیں اور بھی تھیں۔ ہاں سیر و سفر کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔ پہلے ہی ہلے میں ادیبوں کا ایک جہاز بھر کر مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔

کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے
پھر بھی کتنے رہ گئے مگر مے باقی ماہتاب باقی

ادھر مولانا صلاح الدین احمد تھے جو عسکری صاحب کی طرح کنارہ کش ہو کر نہیں بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ موقعہ کی تاک میں تھے۔ موقعہ جلدی ہی آ گیا۔ حلقہ ارباب ذوق کا سالانہ جلسہ ہوا۔ مولانا نے صدارت کی۔ کنونشن اور رائٹرز گلڈ کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شاعری جزویست از پیغمبری۔ ادیب تو پیغمبر ہوتے ہیں۔ کبھی پیغمبروں نے بھی گلڈ بنائے ہیں۔ فقرہ چلنے والا تھا۔ خوب چلا۔

ویسے ہم آپ جیسے پیغمبر تھے۔ وہ ہم آپ جانتے ہی ہیں۔ من آنم کہ من دانم۔

مولانا نے اسی پر بس نہیں کیا۔ زبان کھلی سو کھلی۔ اصل میں سیاسی لیڈروں نے تو بولنا بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ اس زبان بندی کے زمانے میں غیر متوقع حلقوں سے آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ ایک جج صاحب رواں ہو گئے۔ یہ جسٹس کیانی تھے۔ انہوں نے طنز و مزاح کو پردہ بنایا اور جاری ہو گئے۔ مولانا اپنے رنگ سے شروع ہوئے اور ایسے شروع ہوئے کہ ایک دفعہ ایوب خاں کے روبرو بات کرنے پہ تل گئے۔ وہ انجمن حمایت الاسلام کا سالانہ جلسہ تھا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں وہاں کس تقریب سے پہنچا تھا جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ وہ موقعہ تھا جب جمال عبدالناصر نے پاکستان کا دورہ کیا تھا اور جب اس کا لاہور میں ورود ہوا تو میں نے سوچا کہ عربوں کے خاکستر سے یہ جو چنگاری اٹھی ہے اسے ضرور دیکھنا اور سننا چاہیے۔ سو میں نے اپنی اخبار نویسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی استقبالیوں میں اپنی شرکت کا بندوبست کر لیا۔ اسی ریلے میں انجمن کے جلسہ میں بھی جا پہنچا۔ وہاں جمال عبدالناصر کو بعد میں سنا۔ پہلے کچھ اور ہی دیکھنے اور سننے کو ملا۔ دیکھا کہ ایوب خاں کرسی صدارت پر رونق افروز ہیں۔ اور مولانا مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ کیا گرم مقالہ تھا کہ ایوب خاں کے چہرے پہ ایک رنگ جائے ایک رنگ آئے۔ جب اس مرد آہن کے بولنے کی باری آئی تو کھڑا ہوا۔ کہا کہ ابھی مجھے کسی صاحب نے بتایا ہے کہ یہ جو صاحب ابھی بول رہے تھے یہ اردو کے کسی رسالہ کے ایڈیٹر وڈیٹر ہیں۔ تحقیر آمیز لہجہ میں ایسے ہی چند کلمات کہے اور پھر اسی گرمی میں پوری تقریر کر ڈالی۔

مولانا کیا وضع کے پکے تھے۔ جو شعار اپنا لیا پھر مجال ہے کہ اس سے سرمو تجاوز کر جائیں۔ گھنی مونچھیں' بھرا بھڑا جسم' بر میں سوٹ' سر پہ ہیٹ' ہاتھ میں چھڑی جاڑے' گرمی' برسات' کوئی بھی موسم ہو یہ لباس اپنی جگہ قائم ہے۔ سواری سے اجتناب۔ پیدل چلنا شعار میں شامل۔ مئی جون کے ایام' دوپہر کا وقت' چلچلاتی دھوپ مگر مولانا ہیں کہ اسی طرح سوٹ پہنے چھڑی ہاتھ میں لئے پیدل مال پہ چلے جا رہے ہیں۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ادبی دنیا کے دفتر سے کہ مال پر واقع تھا' نکلتے اور چھڑی ٹیکتے نگینہ بیکری کی طرف چل پڑتے۔

اسی شاہراہ پر ادبی دنیا کے دفتر سے تھوڑے فاصلہ پر آفاق کا دفتر تھا جہاں میں کام کرتا تھا۔ اکثر اسی راہ پر میری ان سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔ میں اپنے کالم پر ان سے داد لیتا اور ٹی ہاؤس کی طرف مڑ جاتا۔ وہ آگے جا کر نگینہ بیکری کی طرف مڑتے۔

در بیان بلونگڑا روحانیت

ہاں اسی عمارت کے ایک چھوٹے سے گوشے میں اشفاق احمد نے اپنا داستان گو کا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ ایک ہلکی پھلکی خوبصورت سی ریسنگ سائیکل پر سوار یہاں پہنچتے اور اپنے داستان گو کے شغل میں جت جاتے۔ یہ ہمسائیگی اس روز ختم ہوئی جس روز پروگریسو پیپرز

لمیٹیڈ کو مارشل لا حکومت نے میاں افتخار الدین سے چھین کر اپنے تصرف میں لے لیا اور قدرت اللہ شہاب نے بڑے خضوع و خشوع سے وہ مشہور اداریہ لکھا جو پاکستان ٹائمز میں ''نیو لیف'' کے عنوان سے اور ''امروز'' میں ترجمہ ہو کر ''نیا ورق'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ''لیل و نہار'' کے بھی شب و روز بدل گئے۔ سبط حسن رخصت' اب اشفاق احمد اس پرچے کے ایڈیٹر تھے۔ مگر یہ ایڈیٹری چند روزہ تھی۔ اشفاق کو تو ابھی بہت آگے جانا تھا۔

اشفاق احمد افسانے سے شروع ہوئے تھے۔ پھر افسانہ پیچھے رہ گیا' وہ آگے نکل گئے۔ افسانے کے آسمان کا یہ ٹوٹا ہوا تارا الیکٹرونک میڈیا کے فلک پر جا کر مہ کامل بنا۔ پہلے ان کی ریڈیائی پروگرام تلقین شاہ نے شہرت و مقبولیت حاصل کی اور ایسی شہرت و مقبولیت کہ خود ان کا دوسرا نام تلقین شاہ ٹھہرا۔ پھر ملک میں ٹیلی ویژن آ گیا اور پھر لگا کہ اشفاق کو اصل زبان تو اب ملی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس عزیز نے کچھ اور شوق بھی پیدا کر لیے۔ شوق تصوف کے ساتھ ایک شوق یہ ٹھہرا کہ کسی پہنچے ہوئے بزرگ کو تلاش کیا جائے اور اس سے فیض حاصل کیا جائے۔ پہنچے ہوئے بزرگ کو وہ اپنی محبت کی زبان میں بابے کہتے ہیں۔ بابے کی تلاش کے شوق نے رفتہ رفتہ یہ شکل اختیار کی کہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد کونے کھدڑے سے ٹٹول کر کسی بابے کو لاتے ہیں۔ گھر پہ یاروں کو جمع کر کے کھلاتے پلاتے ہیں' پھر اپنی نئی دریافت پر ان سے داد مانگتے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں جب اس بابے سے جی بھر گیا تو اسے فراموش کیا اور نئے بابے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پھر کوئی نرالا دانہ ڈھونڈ کر لانا' یاروں کی دعوت کرنا اور نئی دریافت پر داد مانگنا۔ اس عمل میں کتنے بابے آئے اور چلے گئے۔ اشفاق احمد اپنی جگہ قائم ہیں۔

اشفاق احمد تصوف سے بھی شغف رکھتے ہیں اور سگان دنیا کے بیچ گزارہ بھی سلیقہ سے کرتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ ان ضدین کے ساتھ نباہ کیسے کرتے ہو' تو انہوں نے مجھے کچھ تصوف کے رموز سمجھائے۔ کہا کہ روحانیت کی دو قسمیں ہیں۔ بندر روحانیت اور بلونگڑا روحانیت۔ بندر روحانیت کیا ہے یہی کہ بندر کا بچہ ماں سے چمٹا رہتا ہے۔ بندریا درختوں کو ٹھوں پر لمبی چھلانگیں لگاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھٹا ہوا ہے۔ اگر کبھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے تو ایسا گرتا ہے کہ اس کا سر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ تو اے بندر کے بچے' اے ظالم و جاہل انسان' تو دانش سے پیوستہ رہ' ورنہ ایسا گرے گا کہ تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔

اور بلونگڑا روحانیت۔ اس کا تت یہ ہے کہ بلی کا بچہ ماں کو نہیں پہچانتا۔ اس سے بے تعلق کسی بھی چیز جو اسے بھا جائے کھیلنے لگتا ہے۔ مگر جب بھوک لگتی ہے یا کوئی افتاد پڑتی ہے تو میاؤں کرتا ہے۔ ماں اس کی پکار سنتی ہے اور دوڑ کر آتی ہے۔ غافل انسان بھی یوں خدا کو بھلا بیٹھتا ہے۔ مگر جب مصیبت پڑتی ہے تو میاؤں کرتا ہے اور اللہ غفور الرحیم فوراً اس کی میاؤں سنتا ہے۔

تو اسے اشفاق احمد کی بلونگڑا روحانیت سمجھو کہ وہ دنیا کے سارے شوق کرتے ہیں۔ ٹی وی ریڈیو سے کھیلتے رہتے ہیں' سیریل پہ سیریل باندھتے چلے جاتے ہیں۔ بیچ بیچ میں میاؤں کرتے ہیں اور اللہ میاں ان کی میاؤں سنتا ہے۔

اشفاق احمد تحریر و تقریر دونوں کے بادشاہ ہیں۔ قلم بھی خوب چلتا ہے۔ زبان بھی خوب جوہر دکھاتی ہے۔ جب وہ محفل میں بیٹھ کر یا سٹیج پر کھڑے ہو کر جاری ہوتے ہیں تو انہیں سنتے جاؤ اور سر دھنتے جاؤ۔ میں جب انہیں سنتا ہوں تو میری ایک آنکھ ہنستی ہے' دوسری آنکھ روتی ہے۔ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ وہ جو ایک بات لچر سی بزبان ملا تھی اسے اس شخص سے اپنی طاقت لسانی سے کیا بنا دیا۔ جب وہ کسی بابے کو تلاش کر کے لاتے ہیں تو میری ایک آنکھ ہنستی ہے' جب مسجد کے ملا کو بانس پہ چڑھاتے ہیں تو میری دوسری آنکھ روتی ہے۔

◆◆◆

زمانہ بدل گیا

صاحبو زمانہ بدل گیا۔ نئی سواریوں کی نمود ہے۔ پرانی سواریاں پسپا ہونے لگی ہیں۔ زمانہ اصل میں سواری کے حساب سے بدلتا ہے یا شاید سواریاں زمانے کے حساب سے بدلتی ہیں۔ بارے اس سڑک کا بیان ہو جائے جسے سیلانی لاہور کا دل جانتے ہیں اور مال روڈ بہت کشادہ نہ ہوتے ہوئے بھی کشادہ اور پرسکون نظر آتی تھی۔ دائیں بائیں چوڑے فٹ پاتھ' بلند و بالا درخت اور سبزے کے تختے' بیچ بیچ میں پھولوں کی کیاریاں' سڑک پر کاریں کم اور تانگے زیادہ۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کوئی بس نمودار ہوتی اور منی بس' ڈبل ڈیکر اور ہاں سائیکلیں' سائیکلوں میں زیادہ نمایاں زنانہ سائیکلیں کہ انقلاب انگیز فلم جس کا نام ''رومن ہولی ڈے'' تھا ابھی یہاں نہیں لگی تھی' سو ہر کمر چوٹیا سے آراستہ نظر آتی تھی۔ کسی کمر پر ایک چوٹیا' کسی کمر پر دو چوٹیاں اور رنگ برنگ قمیصیں اتنی نیچی کہ گٹوں کو چھوتے چھوتے رہ جاتی تھیں۔ سائیکلوں پر دوڑی چلی جا رہی ہیں۔ رخ یونیورسٹی کی طرف ہے۔

اور تانگہ وہ اس شہر میں ابھی ایک معزز سواری سمجھا جاتا تھا۔ شرفاء ٹھسے سے تانگہ کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہیں اور مال سے گزر رہے ہیں۔ دن ڈھلنے لگا ہے۔ ایک تانگہ نمودار ہوا ہے۔ کافی ہاؤس کی سمت اس کا رخ ہے۔ پچھلی نشست پر ایک بزرگ صورت شخص چھڑی سنبھالے بیٹھا ہے۔ بھاری حبثہ' لمبے تڑنگے' مونچھیں بھری بھری' آنکھیں پر عینک لگی ہوئی' یہ مولانا چراغ حسن حسرت ہیں۔ معمول کے مطابق کافی ہاؤس پہنچیں گے روزانہ کی صحبت گرم ہوگی۔

چھریرا بدن' گوری رنگت' پتلے پتلے نقش' سنہری کمانی والی عینک' بر میں بگلے جیسا سفید ململ کا کرتا' پتلی موری والا پائجامہ' یہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ ان کے ادھر سے گزرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ تانگہ میں بیٹھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ان کی اپنی سواری ہے اور تانگہ والا بھی جان لیتا ہے کہ آج کا دن اس سواری کے لے وقف ہے۔ منٹو صاحب شہر کے ہر تانگہ والے سے توقع رکھتے تھے کہ وہ منٹو کو جانتا ہے۔ بالعموم وہ جانتے بھی تھے۔ کوئی بدنصیب سوال پر اس نام سے لاعلمی کا اظہار کرتا تو سمجھ لو وہ منٹو صاحب کی نظروں سے گر گیا۔

مگر وہ معززین بھی تو تھے جو مال پر پیدل چلنا پسند کرتے تھے۔ جون کی تپتی دوپہر ہے۔ سورج سوا نیزے پر آیا معلوم ہوتا ہے۔ ایک بزرگ بر میں سوٹ' سر پہ سولر ہیٹ' ہاتھ میں چھڑی' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے مال کے فٹ پاتھ پر چلتے نظر آتے ہیں۔ یہ

مولانا صلاح الدین احمد ہیں۔ ''ادبی دنیا'' نکالتے ہیں۔ اردو بولو' اردو لکھو کا ورد کرتے ہیں۔ اپنے رسالہ کے دفتر سے نکلتے ہیں۔ شاید نگینہ بیکری کی طرف جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی' مولانا حامد علی خاں' بس ایسے ہی بزرگ ہوں گے جن سے ملاقات کریں گے اور ہاں ایسی ہی گرم دوپہر' بھاری جثے کا آدمی' اسی طرح سوٹ بوٹ ڈالے' سر پہ سولر ہیٹ جمائے آہستہ آہستہ چلتا نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں چھڑی نہیں ہے' اس لیے ہم دور سے دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کہ یہ عبدالمجید بھٹی ہیں۔

شام ہو رہی ہے۔ پروفیسر سراج ہاتھ میں چھڑی گھماتے گورنمنٹ کالج کی طرف سے نمودار ہوتے ہیں۔ ان کے ہمراہ مسز سراج ہیں۔ اتنی دبلی کہ پھونک مارو تو اڑ جائیں' مگر کتنی تیز چلتی ہیں۔ یہ تیز قدم جوڑا سیر کی غرض سے نکلا ہے۔ لارنس باغ تک جائے گا اور واپس اسی راہ اپنے گھر جائے گا۔

اور ہاں صفدر میر' دن ڈھلے انارکلی میں اپنے ٹھکانے سے نکلے۔ ٹی ہاؤس میں جھانکا۔ مختلف میزوں پر نظر ڈالی' جس نوجوان میں اچھے سامع ہونے کے جوہر نظر آئے اسے میز سے اٹھایا۔ ''چلو میرے ساتھ ٹہلنے'' اور نکل گئے لارنس کی طرف۔

مگر ناصر وقت کی قید سے آزاد ہے۔ کبھی ٹیکا ٹیک دوپہر میں کبھی رات گئے یادوں کے ساتھ اس راہ پر بھٹکتا نظر آئے گا۔

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے

لیکن اگر وہ دوپہر کا وقت ہے اور موسم پت جھڑ کا ہے اور ناصر اکیلا سگریٹ پیتا اس راہ پہ جا رہا ہے تو سمجھ لو کہ' پتے جھڑنے کا سماں دیکھنے کے لیے لارنس جا رہا ہے۔

ذرا گھر سے نکل کر دیکھ ناصر
چمن میں کس قدر پتے جھڑے ہیں

مگر ان دنوں تو مال پر بھی اتنے پتے جھڑتے تھے کہ ساری سڑک پر پیلے پتوں کا فرش بچھا نظر آتا تھا۔ وقفے وقفے سے کوئی کار تیزی سے گزرتی تو یہ پتے منتشر ہو جاتے اور پھر جیسے دوڑتی ہوئی کار کا تعاقب کر رہے ہیں۔

مگر صاحبو' وہ زمانہ گزر گیا۔ اب زمانے کا چلن اور تھا۔ اس سڑک کا رنگ بھی اور ہوا۔ پاکستان نے ایک دہائی پوری کر لی تو پھر رنگ فلک بدلا' مارشل لا لگا' اور جرنیل ایوب خان نے کوس لمن الملکی بجایا۔ پھر زمانہ بدلا۔ نئی سواریاں نمودار ہوئیں جو تیز دوڑتی تھیں اور شور سوا کرتی تھیں۔ سکوٹر نمودار ہوا پھر رکشا کی نمود ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی پیلی ٹیکسی کا ورود ہوا۔ اور موٹروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

نئی سواریوں کی اس دوڑ میں تانگہ بہت پیچھے رہ گیا۔ بہت جلد مال پر اس کا داخلہ بند ہو گیا۔ پھر احساس ہوا کہ ٹریفک زیادہ ہے اور سڑک تنگ ہے اسے کشادہ ہونا چاہیے۔ سو دورویہ بلند و بالا درخت کٹنے لگے' سبزے کے تختے ادھڑنے لگے پھولوں کی کیاریاں اجڑنے لگیں' سڑک کو وسیع کیا جا رہا تھا' اس کے دائیں بائیں کچے پکے رستوں کو بغلی سڑکوں کی شکل دی جا رہی تھی۔

لیجئے مال روڈ چوڑی ہو گئی' مگر اہل دل پر وہ تنگ ہوتی چلی گئی۔ پہلے وہ اپنے دورویہ درختوں پر تنگ ہوئی' پھر اپنی سب سے معزز سواری تانگہ پر تنگ ہونے لگی۔ سو مولانا صلاح الدین تنگ ہوئے اور جلدی دنیا سے گزر گئے۔ منٹو صاحب کا تانگہ تو بہت پہلے ہی اس شاہراہ پر نمودار ہونا بند ہو گیا تھا اب مولانا چراغ حسن حسرت نے بھی آنکھ بند کر لی اور وہ تانگہ جو روز دن ڈھلے کافی ہاؤس کی طرف جاتا نظر آتا تھا اب اس شاہراہ پر کیوں نظر آنے لگا تھا۔

اب ہماری سنو۔ میں پہلے یہ بتا دوں کہ رفتہ رفتہ ناصر کے اثر میں آ کر میں بھی اپنی سائیکل کو تیاگ کر پیدل ہو گیا تھا۔ ناصر کے لیے تو ٹولنٹن کے نکڑ پر ایک تانگہ بہر حال منتظر کھڑا رہتا تھا۔ یہ جالندھری تھا۔ وہیں کہیں ایک تانگہ والے نے مجھے بھی پیدل دیکھ کر تاڑا اور اپنی مستقل سواری کے طور پر چن لیا۔

''میرا نام لئیق ہے'' دیر تک اپنے گھوڑے کو تکتکا تکتکا کر جب راہ پر لے آیا تو پھر مجھ سے مخاطب ہوا'' آپ نے کسی تانگہ والے کا ایسا نام نہیں سنا ہو گا۔ میں جی ان سب تانگہ والوں سے الگ کھڑا ہوتا ہوں۔''

''اچھا' وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

بولا'' اجی' یہ سب کے سب تانگہ والے ہیں۔ اس کے ساتھ مل کر میں بھی تانگہ والا بن جاؤں گا۔ میں ان سے بات ہی نہیں کرتا۔ الگ کھڑا رہتا ہوں۔ یہ جو جالندھری ہے جو تمہارے ناصر صاحب کو لے جاتا ہے اس سے بھی میں کلام نہیں کرتا۔''

ویسے جالندھری تانگہ والا بھی اپنی جگہ ایک شے تھا۔ ناصر کاظمی سے ایسا مانوس ہوا تھا کہ رات کو ہم چل پھر کر کسی بھی پہر ٹولنٹن مارکیٹ کے نکڑ پہ پہنچتے' وہ موجود ملتا۔ رات کے ایک بجے کے لگ بھگ یہاں آن پہنچتا' پھر کوئی سواری نہیں لیتا' ہم جب پہنچتے تو اونگھتے اونگھتے جھرجھری لیتا اور چوکنا ہو جاتا۔ ٹولنٹن کے برآمدے میں بیٹھے بوڑھے پنواڑی سے رات کا آخری پان کھاتا' سگریٹ سلگاتا اور تانگہ میں بیٹھ جاتا۔

اصل میں اس نکڑ پر آ کر ہماری پیادہ پائی ختم ہوتی۔ ناصر کرشن نگر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ میں بھی یہاں سے اپنے لیے سواری کا بندوبست کرتا۔ لئیق نے مجھے تاڑا اور جلد ہی اپنی مستقل سواری بنا لیا۔

لئیق کا اپنا رنگ تھا۔ زبان اس کی قینچی کی طرح چلتی تھی۔ ٹولنٹن سے فروز پور روڈ پر نہر کے کنارے تک کا رستہ جہاں میں رہتا تھا اچھا خاصا لمبا رستہ تھا۔ اس پورے رستے وہ کبھی خاموش نہیں پایا گیا۔ رستے میں کوئی سواری مل جاتی تو مجھ سے پوچھتا ''اس وقت اس غریب کو سواری کہاں ملے گی۔ کہو تو بٹھالوں۔'' میں کہتا ''ضرور بٹھالو۔''

مگر پھر یہ سلسلہ اس نے خود ہی بند کر دیا۔ سواری کو دیکھ کر آگے بڑھتا چلا جاتا۔ پھر کہتا ''آپ نے تو اجازت دے رکھی ہے۔ پر میں نے سوچا کہ یہ بات غلط ہے۔ ہماری باتوں میں خلل پڑتا ہے۔

اور باتیں کون سی کوئی پورب کی کوئی پچھم کی۔ سب سے بڑھ کر اپنے معرکے ''صاب جی ایک بیر کیا ہوا کہ میرا بھتنے سے مچیٹا ہو گیا۔ میں نے اسے ٹکر ماری پر اس پہ ذرا جو اثر ہوا ہو۔ پھر میں نے اس کو کوکھی بھر کے دے پٹکا۔ پر وہ نیچے گرنے کے بجائے اور اوپر اٹھ گیا۔ پھر میں سمجھ گیا۔ اے لئیق تو کس سے بھڑ گیا' یہ تو بھتنا ہے' جی رات بھر اس سے کشتم کشتا ہوتی رہی۔ مجھ میں ان دنوں کس بل بہت تھا۔ بس ڈٹا رہا۔ جب پو پھٹی تو میں نے دیکھا کہ اس کی طاقت گھٹ رہی ہے۔ بس میں اسے پٹخنی دینے لگا تھا کہ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ کہا کہ اب کل کی رہی۔ آ جائیو' میں نے کہا کہ آ جاؤں گا۔ سو دوسری رات میں وہاں پہنچ گیا۔ میں بھی ڈنڈ پیل کے تیل مل کے گیا تھا' سالے کو نانی یاد آ گئی ہوگی۔ پر گرا نہیں۔ پھر جب پو پھٹنے لگی اور اس کا زور گھٹنے لگا۔ تو میں نے کہا کہ استاد آج فیصلہ ہو جائے۔ بس اس نے ہار مان لی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ وہ اس جگہ سے تیس میل دور چلا جائے۔ تو جی وہ تیس میل دور چلا گیا۔ بستی والوں نے سکھ کا سانس لیا۔ سب اس سے تنگ تھے۔''

مگر یہ کہانی یہاں ختم تھوڑا ہی ہوئی۔ لئیق نے آگے کی بات اس طرح سنائی۔ ''لو جی اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہمارے نگر سے ایک ٹولی چلی۔ لمبا سفر تھا۔ رستے میں رات ہو گئی اور بارش ہونے لگی۔ انہوں نے ایک پیڑ کے نیچے بسیرا کیا۔ لو جی اتفاق کی بات کہ وہ جگہ ہمارے نگر سے تیس میل دور تھی اور جس پیڑ کے نیچے انہوں نے بسیرا کیا اس میں اسی بھتنے نے اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ یہ بے چارے بھوکے پیاسے کہہ رہے تھے کہ یار مارے گئے آنتیں ہماری قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں' کیسے رات گزرے گی' اوپر سے آواز آئی' فکر مت کرو' کہو تو نیچے آ جاؤں۔ یہ پہلے تو ڈرے' پھر ایک جوان نے ہمت کر کے کہا آدمی کا بچہ ہے تو نیچے آ جا۔ وہ دھم سے نیچے کودا اور ساتھ ہی کھانے کی دیگ۔ کہا' لو کھاؤ۔ انہوں نے ڈٹ کر کھایا۔ جب چلنے لگا تو بولا کہ تم لئیق کو جانتے ہو۔ کہا کہ ہاں جانتے ہیں۔ اچھا تو پہلوان کو میری سلام علیکم دے دینا۔ انہوں نے آ کے مجھ سے کہا کہ لے بھئی جانے وہ کون بلا تھا' تجھے جانتا تھا۔ تجھے سلام علیکم بھجوائی ہے۔ میں نے کہا کہ سامنے برجی پہ رکھ دو۔ بس جی فوراً ہی برجی چٹخ گئی۔''

لئیق رکا۔ پھر بولا ''بس جی مجھے عقل آ گئی۔ سلاما لیکم لے لیتا تو میں چیخ جاتا۔ اسنے سلاما لیکم میں جادو لپیٹ کے بھیجا تھا۔''

پھر ایک رات اس نے اپنا ایک اور معرکہ سنا ڈالا ''صاب جی میں رات کو عورت کی سواری نہیں لیتا۔ عورت کا کیا اعتبار' اندر سے جانے کیا نکلے۔ ایک بیر میرے ساتھ ہو چکی ہے۔''

''کیا ہو چکی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مت پوچھو جی۔ وہ عورت تھی بھی بہت بانکی۔ میرا دل یوں یوں کرے۔ میں نے دل میں کہا لئیق آج تو اپنی قسم توڑ دے۔ تو میں اسے تانگہ میں بٹھانے لگا تھا کہ اچانک میری نظر اس کے پیروں پہ پڑ گئی۔ میں چونکا' ابے لئیق' مارے گئے' یہ تو چھل پیری ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بڑھ کے جھٹ سے اس کے سر کا ایک بال توڑ لیا۔ بس جی وہ تو میرے پیروں پہ گر پڑی۔ چھل پیری کا بال توڑ لو اور زمین میں گاڑ دو' پھر وہ تمہاری لونڈی ہے۔ میں نے یہی کیا۔ کچھ دنوں اس کے ساتھ خوب مزے کیے۔ جب دل بھر گیا اور اس نے بہت منت سماجت کی تو میں نے زمین سے کھود کے بال نکالا اور اس کے حوالے کیا۔ بس فوراً ہی رفو چکر ہو گئی۔''

اگر عورت چھل پیری نہ ہو تو پھر اسے کیسے قابو کیا جائے۔ اس کے بھی بہت سے گر لئیق کے پاس تھے۔ ایک عورت ہی کو قابو میں لانے کا معاملہ نہیں اور کتنے معاملات میں لئیق کو کتنا درک تھا' تو اب ناصر سے زمین و آسمان کی باتیں سننے کے بعد میں لئیق سے ایران توران کی سنتا تھا اور خدا کا کرنا دیکھو کہ اب وہ سواری بھی اسے مل گئی جس پر شروع ہی سے اس کے دانت تھے۔ ایک رات جب ہم ڈولٹن پہنچے تو دیکھا کہ ناصر کا تانگہ والا غائب ہے۔ ناصر کو پریشان دیکھ کر لئیق تانگے سے اتر کر آیا اور فاتحانہ انداز میں بولا۔ ''ناصر صاحب' آپ کا جالندھری اب نہیں آئے گا۔ اس نے تو ٹیکسی خرید لی۔ میں آپ کو پہنچائے دیتا ہوں۔''

ناصر کو گھر پہنچانے کے بعد جب میں اپنے گھر کی طرف چلا تو رستے میں لئیق کہنے لگا۔ ''جالندھری بھی سچا تھا' تانگہ کا کاروبار اب بہت مندا جا رہا ہے۔''

میں بولا۔ ''تو کیا تم بھی ٹیکسی کی سوچ رہے ہو۔''

''توبہ کرو جی۔ تانگہ چلانے کے بعد ٹیکسی چلاؤں۔ نہیں جی نہیں۔ اور میں اپنے گھوڑے کو کیسے چھوڑ دوں۔ یہ میری بات سمجھتا ہے۔ ٹیکسی تو مشین ہے' مشین تو میری بات نہیں سمجھے گی۔ پتا ہے جی ایک بیری کیا ہوا۔ دور کی سواری تھی۔ پہنچا کے پلٹا تو رستے میں رات ہو گئی۔ وہیں کہیں ایک سرا کے پاس ایک کھٹیا مل گئی۔ پڑ رہا۔ رات کو کیا ہوا کہ ایک بھینسا مجھ پر ارا پڑا۔ سینگ سینے میں جا کر ایسا لگا کہ میں ٹیس ہو گیا۔ لو جی گھوڑے نے جو دیکھا تو اس نے رسہ تڑایا اور بھینسے سے بھڑ گیا۔ بھینسے کو ایسی دلتی ماری کہ بس وہ فوراً ہی

ڈھیر ہوگیا۔ پھر میرے پاس آیا۔ میں نے کہا کہ بھئی گھوڑے ہم تو جا رہے ہیں۔ اس نے سر میرے کاندھے پر رکھ دیا اور رونے لگا۔ ہمت کر کے میں تانگہ میں بیٹھا۔ گھوڑے سے کہا کہ بھئی گھوڑے ہمیں ہوش نہیں۔ اب تو خود ہی چلا چل۔ تو جی گھوڑا خود ہی چل کے تھاں پہ آ گیا۔ انتظار صاب ایمان کی کہو ایسے گھوڑے کو کیسے چھوڑ دوں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔"

"انتظار صاب گھوڑا تو گھوڑا ہوتا ہے۔ مشکل وقت میں ساتھ دیتا ہے۔ اس سالی مشین کا کیا اعتبار۔ اس سے تو دوستی نہیں ہو سکتی۔"

تو خیر ناصر بھی اب لئیق کی سواری تھا اور اب رات کو تانگہ کا سفر اس طرح سے تھا کہ لئیق پہلے ناصر کو کرشن نگر پہ چھوڑتا' پھر وہاں سے مجھے لے کر چلتا۔ اس کی داستان طرازیوں پر ناصر کی طرف سے جو ردعمل آتا اس سے اس کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہوئی اور وہ ہم سے روز بروز زیادہ مانوس ہوتا گیا۔

اس بیچ دو واقعے گزرے۔ ایک تو ہم نے ٹی ہاؤس سے نقل مکانی کی اور لارڈز میں جا کر اپنی محفل آراستہ کی۔ ٹی ہاؤس سے نقل مکانی کی بڑی وجہ احمد مشتاق تھا' جس کی تلخ نوائی اب ناصر پر بھاری پڑ رہی تھی۔ مارش لا کیا آیا کہ ایک عسکری صاحب کو چھوڑ کر باقی سارے ہی ادیبوں کی دیانت مشتاق کی نظروں میں مشکوک ہوگئی۔ ادیب کو اس وقت کلمہ حق کہنا چاہیے' یہ تھا مشتاق کا مطالبہ۔ اور سب سے بڑھ کر ناصر سے۔

ناصر نے اس کا وعظ بہت سنا۔ پھر کہا کہ "مشتاق' میں تو ایک مرتبہ سچ بول کر کربلا میں سر کٹا چکا' اب تیری باری ہے۔"

اس شام تو خیر مشتاق کا منہ بند ہوگیا' مگر پھر وہ ہر بہانے یار و اغیار سب پہ حملہ آور ہونے لگا۔ اور ناصر نے طے کیا کہ اب ٹی ہاؤس چھوڑ کر کہیں اور بیٹھنا چاہیے۔ میٹرو پر تو زوال آ چکا تھا۔ اس کی راتیں تو اسی وقت اجڑ گئی تھیں جب ایجلا وہاں سے رخصت ہوئی تھی۔ پھر وہ اجڑتا ہی چلا گیا' حتیٰ کہ ہوٹل بند ہوگیا۔ اس ہوٹل کی یادگار جو وہاں رہ گئی تھی وہ صندلی بلی تھی۔ اس کھنڈر میں وہ کتنے دنوں تک منڈلاتی رہی' مگر پھر وہ عمارت ہی گرا دی گئی اور ایک نئی عمارت واپڈا کے نام پر وہاں تعمیر ہونی شروع ہوئی۔ مال روڈ پر اس زمانے میں ایک ریستوران لارڈز کے نام سے بہت شان کے ساتھ کھلا تھا۔ ناصر نے اس جگہ کو اپنے نئے ٹھکانے کے طور پر انتخاب کیا۔ ٹی ہاؤس سے دو اور ستارے ٹوٹے۔ منیر شیخ اور سجاد باقر رضوی' یوں ہم چار نے مل کر اس چائے خانے کو آباد کیا۔ یوں سمجھئے کہ ہم اس ریستوران کے جو عرصے تک شہر میں مقبول رہا اولین آبادکاروں میں تھے۔

تو اب ہم ایک بجے کے لگ بھگ یہاں سے اٹھتے۔ مگر ناصر کی روانی گھڑی کی سوئی کی پابند تو نہیں تھی۔ گھڑی کی سوئی ایک سے

آگے نکل جاتی اور بیان جاری رہتا۔ تب دروازے میں آ کر ایک چہرہ جھانکتا۔ یہ لئیق کا چہرہ ہوتا۔ گویا یہ یاد دہانی تھی کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ لئیق نے اب ہماری خاطر ٹولنٹن سے ہٹ کر ریگل چوک پر آ کر کھڑا ہونا شروع کر دیا تھا۔ مال پر تانگہ نہیں چل سکتا تھا' اس لیے وہ تانگہ لارڈز کے سامنے نہیں لا سکتا تھا۔ ریگل کے اڈے پہ کھڑا انتظار کرتا رہتا۔ جب دیر ہو جاتی تو تانگہ وہیں چھوڑ ہمیں یاد دہانی کرانے کے لیے آتا۔ ناصر اٹھ تو جاتا مگر ریگل چوک میں آ کر کہتا کہ ابھی تو ہمیں مال پہ تھوڑا چلنا ہے۔ تم پچھلی سڑک سے ولنٹن کے نکڑ پہ پہنچ جاؤ۔ چلئے ٹولنٹن کے نکڑ پہ لئیق پہنچ گیا۔ وہاں سے ہم تانگہ پر سوار بھی ہو لیے اور ناصر کے گھر تک بھی پہنچ گئے مگر وہاں پھر دروازے تک پہنچتے پہنچتے کوئی نئی داستان شروع ہو جاتی اور لئیق کو پھر اچھا خاصا انتظار کھینچنا پڑا۔

لئیق نے تو اپنی طرف سے بہت نباہی' وفا ہماری ہی طرف سے ہوئی۔ بس ہم نے سواری بدل لی۔ تانگہ کی سواری سے زقند لگا کر موٹر سوار بن گئے۔

تھوڑے عرصے بعد لئیق ایک شام ٹی ہاؤس آیا۔ بتایا کہ میں نے تانگہ کا کام چھوڑ دیا ہے۔ ''پھر؟'' میں نے پوچھا ''کوئی ٹیکسی مل گئی؟''

''نہی جی' میں نے کہا تھا کہ تانگہ چھوڑ بھی دوں تو بھی ٹیکسی کا کام نہیں کروں گا۔''

''پھر کیا کر رہے ہو؟''

''کباب بیچنے شروع کر دیئے ہیں۔ آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔ کھا کر دیکھئے اور بتایئے کہ کیسے ہیں؟'' یہ کہتے کہتے اس نے ایک بڑا سا پڑا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس میں شامی کباب لپٹے ہوئے تھے۔

تو لئیق نے تانگہ کو سلام کر لیا تھا اور مال پر تانگہ کا داخلہ ممنوع ہو چکا تھا۔ اب یہ شاہراہ نئی سواریوں کے شور سے گونج رہی تھی اور شور سا شور۔ ایک شور رکشاؤں کا' دوسرا شور سکوٹروں کا' پھر موٹر ٹیکسیاں' موٹریں' اومنی بسیں' اس ہجوم میں سائیکلیں تو خیر جیسے کیسے چلتی رہیں' لیکن زنانہ سائیکل زیادہ دیر سواریوں کے اس ہجوم سے مقابلہ کی تاب نہ لا سکی۔ ہاں رومن ہولی ڈے' کے بعد سے سائیکل والیاں بھی تو بدل گئی تھیں۔ کمر اور چوٹی کا وہ عالم اب کہاں۔ آدرے ہیپرن والا سٹائل اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ زلف دراز کی حکایت مختصر ہوتے ہوتے بس جیسے غزل تک رہ گئی ہو۔ ہاں قمیص کے دامن میں بھی تو اختصار آ گیا تھا۔

اور وہ جو مال پر خوانچے والے تھے ایسے کہ جیسے مال میں ان کی نال گڑی ہو' وہ کہاں گئے قلفیوں والا کہاں گیا۔ پانی کے بتاشوں والا کہاں گیا۔ خود ہماری اپنی دکان مال سے اب اٹھنے لگی تھی' مگر خیر اس کا تعلق مال کی نئی چال سے نہیں تھا۔ وہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کو

مارشل لا ''آفاق'' کو نہ پہلے راس آیا تھا نہ اب راس آیا۔ میں نے ڈوبتے آفاق کو بال آخر سلام کر لیا۔ کیا کرتا بس پھر چند برسوں تک فری لانسنگ ہمارا مقدر ٹھہری۔ تھوڑی انگریزی اخبار نویسی' تھوڑی اردو کالم نگاری' کبھی یہاں' کبھی وہاں' ترجمہ بازی اور ہاں ایک ادبی رسالہ کی ایڈیٹری' حلقہ کے جلسہ کے بعد ٹی ہاؤس میں چائے کا دور چل رہا تھا۔ صوفی صاحب نے یعنی کہ صوفی تبسم نے جو آج حلقہ کی صدارت کے لیے آئے تھے مجھے دیکھا' بولے ''کاکے تیرا اخبار تو بند ہو گیا' اب کیا کر رہا ہے۔''

میں نے بتایا کہ فی الحال راوی میرے لیے آزادی لکھتا ہے۔ یا کہہ لیجئے فری لانسنگ۔ بولے ''پھر کچھ ''لیل ونہار'' کے لیے لکھو۔ میں نے فوراً حامی بھر لی۔ کہا کہ کل ہمارے دفتر کی طرف آؤ۔ دوسرے دن اس طرف گیا تو دیکھا کہ صوفی صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ اصل میں اشفاق احمد یہاں سے نکل کر ترقی کے راستے پر آگے نکل گئے تھے۔ اب یہاں صوفی صاحب تھے اور ان کا حقہ تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں آگے سبط حسن پائپ پیتے نظر آیا کرتے تھے۔ ''لیل ونہار'' کیا خوب ہفت روزہ تھا۔ کس دھوم سے نکلا۔ ہفت روزہ صحافت میں کیا معیار قائم کیا۔ سید سبط حسن کے پائپ سے شروع ہوا اور صوفی صاحب کے حقے کی گڑگڑاہٹ پر جا کر ختم ہوا۔

حلقہ کا حوالہ آیا ہے تو اب مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ہم ہر پھر کر پھر حلقہ میں آن پہنچے تھے' مگر کب اور کیسے؟ مجھے ذرا یاد کر لینے دیجئے۔ ناصر کی دائری کا ایک ورق میرے سامنے کھلا ہے۔

''21 جولائی 1961ء صبح کے وقت بارش ہوئی۔ صبح نو بجے سے بارہ بجے دوپہر تک گرڈ ینیا ہوٹل میں رہا۔ حلقہ ارباب ذوق کی رکنیت کا فارم پر کیا کہ حلقہ کی مجلس عاملہ نے میری شرائط قبول کر لیں۔''

ہم ساتھ ساتھ نکالے گئے۔ واپسی بھی ساتھ ساتھ ہی ہوئی تھی۔ اصل میں اس دوران حلقہ میں بھی تو ایک خاصا انقلاب آ چکا تھا۔ ایک ایسی بغاوت ہوئی کہ کرسیاں چل گئیں۔ اصل میں حلقہ کے کچھ مہربان یوں سمجھ لیجئے کہ حلقہ کے گئے دنوں کے خاص الخاص آج کل بڑے سرکاری عہدوں پر متمکن تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں حلقہ کے ساتھ نیکی کی کہ اس کے لیے سرکاری گرانٹ کا اہتمام کیا۔ قیوم صاحب یہ سوچ کر خوش تھے کہ حلقہ کے دلدر دور ہوئے۔ فارغ البالی کے دن آئے' مگر حلقہ میں وہ آزاد منش روحیں بھی تو بیٹھی ہوئی تھیں جنہیں شک ہوا کہ یہ تو ادیبوں کی آزادی کا سودا ہو رہا ہے۔ انہیں وہ دن یاد آئے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے ختم ہو جانے کے بعد مختلف ترقی پسند ادیبوں نے حلقہ میں آنا جانا شروع کیا تو حلقہ پر اوپر سے دباؤ پڑنے لگا اور پوچھ گچھ ہونے لگی کہ یہ حلقہ میں کیا ہو رہا ہے اور حلقہ کے عہدیداروں کو پوچھ گچھ کرنے والوں کے سامنے جا جا کر یہ وضاحتیں کرنی پڑیں کہ حلقہ ایک آزاد

ادبی ادارہ ہے۔ وہ کسی ادیب پر اپنے دروازے بند نہیں کر سکتا۔ یہ اس کی روایت کے خلاف بات ہوگی۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ سرکاری گرانٹ سے حلقہ کے دن تو پھر جائیں گے' مگر ایک آزاد ادبی پلیٹ فارم کے طور پر جو اس کی روایت قائم ہوئی ہے وہ کیسے برقرار رہے گی۔ سو سرکاری گرانٹ کے مسئلہ پر اختلاف شروع ہوا اور اتنا بڑھا کہ جلسہ میں کرسیاں چل گئیں۔ چشم دید گواہوں نے بتایا کہ سب سے ظالم کرسی وہ تھی جو قیوم صاحب کی ہم نوائی کے جوش میں منیر نیازی نے سجاد رضوی پر کھینچ کر ماری تھی۔ وہ تو یوں کہئے کہ سجاد رضوی کو مولا کی مجلسیں پڑھنے کے لیے زندہ رہنا تھا سو نشانہ چوک گیا ورنہ حق و باطل کے اس معرکہ میں سید زادے کی شہادت لکھی گئی تھی۔ شاعر جلدی جلال میں آ جاتا تھا یا شاید جلال ہی میں رہتا تھا۔ لیکن ہمعصروں کی قسمت اچھی تھی کہ نشانہ خطا ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ جلال میں آ کر سامنے رکھا پانی سے بھرا جگ اٹھایا اور کھینچ کر صفدر کے سر پہ مارا۔ مگر پھر نشانہ خطا ہو گیا۔ جگ دیوار میں جا کر لگا۔ صفدر کا سر بال بال بچا۔

شان قلندرانہ' طبیعت جلالی' مزاج لاابالی' لاابالی پن کے ساتھ تھوڑی تعلّی ''شاعری میں میرا حال ایسا ہے جیسے جنگل میں برگد تلے سدھارت بیٹھا ہو۔'' مگر جنگل اور برگد کی بات کرتے کرتے منیر نیازی کو ایک اور خیال آیا ''سدھارت کی جگہ اور کوئی ہوتا تو جنگل کی دہشت اسے ختم کر دیتی۔ تنہائی اور خلا سے آنکھیں چار کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔''

میں نے کہا ''منیر نیازی ایک طرف تم اتنے اکل کھرے ہو کہ دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتے۔ تصوریوں کرتے ہو کہ جنگل میں برگد تلے اکیلے بیٹھے ہو۔ دوسری طرف ایک نیا شہر بسانے کا خواب دیکھتے ہو۔''

''تنہا آدمی کا یہی تو المیہ ہے کہ وہ آبادی کے لیے' رونق کے لیے روتا ہے۔ پھر وہ کسی برگد تلے' یا کسی غار میں بیٹھ کر سوچتا ہے کہ رونق کیسے پیدا کی جائے' کیسی بستی بسائی جائے؟''

''مگر بستی میں آدمی تو ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے سوا بہت سی مخلوق ہوگی' بہت سے آدمی۔''

''مگر کیسے آدمی' میں چنگیز خان کی طرح کے آدمی نہیں چاہتا۔ میں ایسے خدا پرست لوگ دیکھنا چاہتا ہوں جن میں احساس جمال ہو' ایسا احساس جمال کہ خبیث قوتیں اس کے رعب میں آ جائیں۔ میں اپنی شاعری سے ایسے ہی آدمی تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

گوتم بدھ سے لگاؤ' چنگیز خان سے نفرت' تشدد سے بیزاری' محبت میں ایمان۔'' پاکستان بننے سے پہلے ہمارے درمیان کتنی محبت تھی' اس لیے کہ ہمارے درمیان مکالمہ جاری تھا' مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ مکالمہ رک گیا۔ آپس میں جب مکالمہ رک جائے تو پھر

پستولوں سے مکالمہ ہوتا ہے۔"

مگر یہ تو اب سے بیس پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ اب تو خیر خود منیر کے ہاتھ میں پستول ہے۔ میں نے یاروں سے سنا کہ کوئی ایسا واقعہ ہوا کہ منیر کو پستول چلانا پڑا۔ میں نے اسے فون کیا' خیریت معلوم کی اور واقعہ معلوم کیا۔ کہا کہ "یار' یہ زمانہ بہت خراب ہے' کچھ اوباش قسم کے نوجوان تھے۔ انہوں نے میرے گھر پہ پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔ میرے پاس ایک پرانا دھرانا پستول پڑا تھا' اسے اٹھایا اور ٹیرس پر آ کر ایک دو فائر کیے' وہ بدبخت بھاگ گئے۔"

"شاعر اور پستول؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"مت بھولو کہ میں پٹھان بھی ہوں۔" پھر بتانے لگا کہ "یار وہ پستول تو بہت پرانا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی پستول اب آؤٹ آف ڈیٹ ہے۔ میں نے اب موذر خرید لیا ہے۔"

"یار ان نئے ہتھیاروں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ موذر کیا چیز ہوتی ہے۔ کیسا ہوتا ہے؟"

"کبھی تم میری طرف آؤ' میں تمہیں موذر دکھاؤں گا۔ چلانا بھی سکھا دوں گا۔ لائسنس بھی دلوا دوں گا۔ زمانہ خراب ہے۔ تمہارے پاس بھی موذر ہونی چاہیے۔"

"ہونی تو چاہیے مگر افسوس کہ میں پٹھان نہیں ہوں۔ اور یہ جاننے کے باوجود کہ تم پٹھان ہو' مجھے یہ بات نہیں بھولتی کہ اولاً تم شاعر ہو۔"

"یار جب میں لائسنس لینے گیا تو وہ جو وہاں ایک افسر تھا' اسی نے یہی کہا تھا کہ نیازی صاحب آپ تو شاعر ہیں۔ آپ کو موذر کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ شاعر تو میں ہوں' مگر تم لوگوں نے خیالات ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ مجھے موذر کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔"

موذر اب منیر نیازی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ مزاج وقت گزرنے کے ساتھ خاصا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ جوانی میں تو جلال سر پہ سوار رہتا تھا' ایسا کہ کرسی سامنے ہوئی تو حریف پر کرسی دے ماری' جگ ہاتھ پڑا تو جگ کھینچ مارا۔

بہرحال سجاد رضوی کی ہڈی پسلی تو ٹوٹنے سے بچ گئی۔ ہاں قیوم صاحب کا زور حلقہ میں ٹوٹ گیا۔ انہوں نے حلقہ سے منہ موڑا اور خانہ نشین ہو گئے۔ بس اس کے بعد راندگان حلقہ کی واپسی کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔ سو ہمیں کسی نہ کسی روز واپس آنا ہی تھا۔ دیر ہماری ہی طرف سے ہوئی۔ خاص طور پر ناصر کی طرف سے۔ آخر شاعر کی بھی تو کوئی اکڑ ہوتی ہے۔ ادھر یار کہہ رہے تھے کہ بہت ہو گئی' غصہ

تھوک دو اور واپس آ جاؤ۔

قیوم صاحب کے جانے سے حلقہ میں جو اقتدار اعلیٰ کا خلا پیدا ہوا اسے اعجاز حسین بٹالوی نے پر کیا۔

''مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''

بات یہ ہے کہ بعض خاص شخصیتیں بعض خاص کام انجام دینے کے لیے پیدا ہوتی ہیں اور وہ ملک ہو یا انجمن وہ اپنی تعمیر اور استحکام کے لیے کسی ایسے نابغہ کا محتاج ہوتا ہے جو انتظامی صلاحیتوں سے متصف ہو اور انتشار اور تخریب کے عناصر کا قلع قمع کرنے کا زور و اثر رکھتا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے شخص کا اقتدار بالعموم آمرانہ مزاج ساتھ لے کر آتا ہے' نہ بھی ساتھ لائے تو اقتدار کے طول پکڑ جانے کے ساتھ یہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ سو یہ تو بشری کمزوری ہے۔ آدمی ولی ہو تب ہی اس کمزوری پر قابو پا سکتا ہے۔ قیوم صاحب آخر آدمی تھے۔ شاعر ضرور تھے' ولی نہیں تھے۔ ولیوں والی صفات اگر تھیں تو میراجی میں تھیں' مگر میراجی حلقہ کو ادبی آدرشوں سے مالا مال کر سکتے تھے' منتظم نہیں بن سکتے تھے۔ حلقہ کے معمار اعظم قیوم صاحب تھے۔ ان کے چلے جانے کے نقصان کا پتا تو اس وقت چلا جب ساتھ کی دہائی کے اواخر میں حلقہ کا انتظام کمزور پڑا اور اس سے فائدہ اٹھا کر وہ مخلوق دندنانے لگی جو اس وقت کی سیاست کی پیداوار تھی۔ ادب کو انقلاب کی راہ میں حائل جانتی تھی۔ بس پھر حلقہ پنپ نہیں سکا۔

اعجاز حسین بٹالوی نے شروع میں انتظام خوب چلایا' مگر وہ حلقہ پر زیادہ عرصے تک وہ توجہ نہ دے سکے جو وہ مانگتا تھا۔ قیوم صاحب نے ایک مرتبہ واپس آنے کی ہمہی باندھی بھی تھی۔ یہ اس وقت ہوا جب اعجاز حسین بٹالوی اور یاروں نے مل کر دوبارہ مجھے سیکرٹری کے لیے نامزد کیا۔ اغیار نے جا کر قیوم صاحب کو اس تشویش ناک صورت حال سے باخبر کیا اور انہیں الیکشن کے میدان میں لا اتارا۔ خیر قیوم صاحب نے تو اپنی ہار کو اپنے روایتی قہقہہ میں اڑا دیا' مگر امجد الطاف اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ حلقہ کے بیچ سسکیاں بھر کر روئے۔ پھر اٹھ کر چلے گئے۔

بس اس کے بعد سمجھ لیجئے کہ سالوں بعد میری ملاقات قیوم صاحب سے اس وقت ہوئی جب وہ پاکستان کونسل میں ڈائریکٹر بن کر آئے۔ اس وقت تک حلقہ کی وہ ساری سیاست قصہ ماضی بن چکی تھی۔ قیوم صاحب کے لیے بھی میرے لیے بھی۔ میں نے اب اپنے اندران سے اپنی پرانی نیازمندی کی تجدید کر لی تھی۔ اسی حساب سے ان سے ملتا تھا۔

اب سوچتا ہوں کہ میں کسی صورت ہار جاتا یا دوست مجھے اپنا نام واپس لینے کی اجازت دے دیتے اور قیوم صاحب حلقہ میں واپس آ جاتے تو کیا عجب تھا کہ حلقہ انقلابی مخلوق کی یلغار سے محفوظ رہتا۔ یہ مخلوق بھی کچھ اس طرح آندھی دھاندی حلقہ پہ آ پڑی جیسے

قدیم زمانوں میں وحشی قبیلے مہذب پرامن بستیوں پر آ پڑتے تھے اور ساری پرامن مہذب زندگی کو تلپٹ کر دیتے تھے' مگر یہ ذکر بعد میں درمیان میں جو قصے قضیے ہوئے پہلے ان کا ذکر تو کرلوں۔

◆◆◆

امریکہ، افریشیا، تھنکر زفورم

لیجئے پھر ایک ادبی پرچے کی ادارت میرے نام لکھی گئی۔ نذیر چودھری نے پہلے ناصر سے مسکوٹ کی' پھر افتخار چودھری کو لے کر ٹی ہاؤس آئے۔ کہا کہ ان دنوں تو تم اخبار سے فارغ ہو' ادب لطیف کی ادارت سنبھال لو۔

میں نے کہا کہ ''چودھری صاحب' میں تو رجعت پسند ہوں'' ''ادب لطیف'' سدا کا ترقی پسند۔ میرا اس کا کیا جوڑ۔''

مگر زمانہ ادھر بھی تو بدل گیا تھا۔ جب سویرا' ترقی پسند نہ رہا تو ادب لطیف' کتنے دن اس لکیر کا فقیر بنا رہ سکتا تھا۔ سو سمجھوتہ ہو گیا۔ مگر ادھر میری ادارت کی خبر نکلی اور ادھر ترقی پسندوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ترقی پسندوں کا ایک ہی تو ٹھیارہ گیا تھا۔ اس پر بھی ایک رجعت پسند کو لا کر بٹھا دیا۔

روز ڈھیر ساری ڈاک آتی اور چودھری افتخار اسے میرے سامنے ڈھیر کر دیتے۔ میں نے کہا کہ چودھری صاحب اب بھی وقت ہے' سوچ لیجئے۔ بولے' سوچ لیا ہے۔

مگر ایک حملہ غیر متوقع تھا۔ تھا ترقی پسندی ہی کے نام پر اور غالی ترقی پسند ہی کی طرف سے' مگر مجھے اس طرف سے حملہ کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ پہلا پرچہ نکلا اور ادھر سے صفدر میر شروع ہو گئے' مگر خطا مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ صاحب فقرہ بازی کا چسکا برا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اچھا بھلا آدمی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ خیر اچھا فقرہ اچھے دوست کا بدل بیشک نہ ہو لیکن کسی حد تک تلافی تو ہو ہی جاتی ہے۔ پچھتاوا اس صورت میں ہوتا ہے کہ احتیاط میں فقرہ بھی بیچ میں رہ جائے اور دوست بھی ہاتھ سے نکل جائے' مگر میں کرتا کیا' مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑی تھی۔ وہ رائٹرز گلڈ کی گہما گہمی کا زمانہ تھا۔ شفقت تنویر مرزا نے بڑی جدوجہد کر کے گلڈ کی پنجاب شاخ میں پنجابی کی شاخ بنوائی۔ اہتمام سے اس کا افتتاحی جلسہ کیا۔ مجھے اس جلسہ میں مضمون پڑھنے کی دعوت دی۔ میں نے پہلے تو عذر کیا کہ رائٹرز کنونشن کے بعد سے گلڈ کے کسی بکھیڑے میں نہیں پڑا ہوں' نہ اس کی کسی تقریب میں مضمون پڑھنے کا شرف حاصل کیا ہے' مگر پھر سوچا کہ اس عزیز سے ایک زمانے سے وضعداری چلی آتی ہے

''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''

آمادہ ہو گیا۔ بس نصیب ہی برے تھے کہ ایک فقرہ اچٹتا سا صفدر کی طرف چلا گیا۔ جانے کس نے کان میں جا کر کیا پرویا اور

فقرے کو کس طرح رپورٹ کیا۔ ادھر سے تیر پہ تیر چلنے لگے۔

ارے ابھی تو میری مارکسی تعلیم شروع ہی ہوئی تھی۔ صفدر نے کتنی مشکلوں سے کتابوں کے انبار تلے سے ایک ضخیم جلد برآمد کی ''لو پہلے تم اینگلز کو پڑھ لو۔'' اور اینگلز کو ابھی پڑھا ہی تھا کہ کھیل بکھیڑا ہو گیا۔

میں ابھی کہہ رہا تھا کہ آدمی چھوٹا نہ ہو تو لڑنے میں مجھے کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ قدیم شجاعان عرب میدان میں اتر کر پہلے مقابل کا حسب نسب پوچھتے تھے۔ جب پتا چلتا کہ حریف حسب نسب والا ہے تو پھر اطمینان سے لڑتے تھے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ اس سے آگے کی بھی ایک بات ہے۔ میں نے اپنی نانی اماں سے سنا تھا کہ آدمی لڑے تو ایک آنکھ لڑنے کی رکھے تو دوسری آنکھ ملنے کی رکھے، مگر بندہ بشر ہے۔ کبھی کبھی ملنے والی آنکھ بھی اندھی ہو جاتی ہے۔

ہاں ایک بات اور۔ ادب کو لڑائی وہ زیب دیتی ہے جو کسی نقطہ نظر کسی ادبی نظریے کے حوالے سے ہو۔ ذاتی لڑائی تو ہم سے بہتر کنجڑے قصائی لڑ لیتے ہیں۔ لڑائی بری چیز ہے مگر ادب میں آ کر اچھی چیز بن جاتی ہے۔ ادب میں لڑائیاں ہوتی رہنی چاہئیں۔ باقی پھر وہی بات کہ بندہ بشر ہے۔ ادبی لڑائی میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر اوقات کسی نہ کسی رنگ میں ذاتیات بھی راہ پا جاتی ہے۔ چلئے یوں بھی سہی ادیب خالص عقل اور دماغ تو نہیں ہوتے۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ سو ادبی جنگ میں جذبات و احساسات بھی راہ پائیں گے اور ذاتی جھگڑے کا رنگ بھی پیدا ہو گا۔ مگر یہ رنگ بقدر نمک رہے تو بہتر ہے اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ صفدر سے ان دنوں لڑائی میں نمک تیز ہو گیا تھا۔

قصہ مختصر میں نے ''ادب لطیف'' کی ادارت ایک اچھے خاصے ہنگامے میں شروع کی تھی۔ یعنی یہ ادارت ''خیال'' کی ادارت سے مختلف تھی۔ وہاں مقصود یہ تھا کہ ہنگامہ پیدا کیا جائے۔ یہاں یار و اغیار نے خود ہی ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ویسے میرے حساب سے تھا یہ میری ادارت کے لیے بہت مناسب زمانہ۔ ''خیال'' کے اجرا کے وقت ہم نے نئی نسل کا سوال ضرور کھڑا کیا تھا مگر نئی اور پرانی نسل کا فرق کوئی ایسا واضح نہیں تھا۔ اب بہت واضح نظر آ رہا تھا۔ خاص طور پر افسانے میں۔ تیسری اور چوتھی دہائی میں پروان چڑھنے والی نسل کا طرہ امتیاز تو حقیقت نگاری کا اسلوب تھا۔ پانچویں دہائی کے وسط تک اس کا بول بالا رہا، مگر یہ اسلوب اب جیسے باسی ہو گیا ہو اور نئے افسانہ نگار کو جیسے کسی تازہ اسلوب کی تلاش ہو۔ ثقہ ایڈیٹروں کو شروع میں ایسے افسانے کو قبول کرنے میں تامل تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ افسانہ مبہم ہے بلکہ بے معنی ہے۔ میرے حساب سے اس وقت بے معنی لکھنے کی بھی ایک معنویت تھی۔ لکھنے والا اگر بے معنی لکھنے کا خطرہ مول نہیں لے گا تو نئے معنی تک کیسے پہنچے گا۔ باقی کیا ضروری ہے کہ اس سفر میں سب ہی سرخرو ہوں۔ جو سرخرو نہیں ہوں گے ان کا

نام قربانی دینے والوں کی فرد میں لکھا جائے گا۔ نئے افسانے کے نام پر قربانیاں بہت دی گئیں۔ ویسے نئی شاعری کے نام پر بھی قربانیاں کم نہیں دی گئیں۔ انہیں دنوں نئی لسانی تشکیلات کا شگوفہ پھوٹا۔ اس نام پر کتنے نوجوانوں نے ٹی ہاؤس کے بیچ اپنے نام کا نقارہ بجایا۔ پھر ٹی ہاؤس ہی میں کھیت ہو گئے۔ نئی شاعری کے لیے قربانیاں دینے والوں میں ان کے نام لکھے گئے۔ ہمارا افسانہ بھی اس وقت ایسے آشفتہ سروں کا طلبگار تھا۔ انہی آشفتہ سروں میں وہ جوان انور سجاد بھی تھا' مگر وہ ٹی ہاؤس سے اپنے افسانے کو بچا کر لے گیا۔ اس کے نقارے کی آواز دور تک گئی۔ جس نے سمجھا اس نے سر دھنا' جس نے نہ سمجھا اس نے اور زیادہ دھنا۔ میں نے اس عزیز کے افسانے کو ادب لطیف کی زینت جانا اور پرچے کا آغاز اسی کے افسانے سے کیا۔

خالدہ اصغر نے جو بعد میں خالدہ حسین کہلائیں' اسی زمانے میں پر پرزے نکالے تھے۔ اس بی بی کی طرف سے موصول ہونے والا پہلا ہی افسانہ ناصر کو بھا گیا۔ پھر اس کے لکھے تعارف کے ساتھ وہ افسانہ شائع ہوا۔ ادھر ہندوستان میں بھی اس نئی طرز کی بہت دھوم تھی۔ بلراج منیرا ایسے لکھنے والوں کا سرخیل بنا ہوا تھا۔ ایسا مال ادھر سے بٹورتا تھا اور ادب لطیف کے لیے بھیج دیتا تھا۔ سیندر پرکاش کا افسانہ مجھے اسی کی معرفت موصول ہوا تھا۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ ان برسوں میں امریکہ سے ادیبوں کی سوغات کچھ زیادہ ہی آئی تھی۔ پال اینگل آئے' جسی سٹوریٹ آئے' کیرولین کائزر آئیں۔ پال اینگل کو تو خیر میں نے اور ناصر نے مل کر ٹی ہاؤس جھنکایا' تانگہ میں بٹھا کر اندرون شہر کی سیر کرائی کہ دیکھو ہماری روایتی سواری یہ ہے اور روایتی گلی کوچے ایسے ہیں۔ مگر جسی سٹوریٹ کا ورود پاکستان میں عجب زمانے میں ہوا۔ اس وقت امریکہ کے خلاف ردعمل اپنے عروج پر تھا۔ جلتی پہ تیل کا کام اس خبر نے کیا کہ ہندوستان سے امریکہ کا سودا ہوا ہے جس کے تحت امریکہ ہندوستان کو ہتھیار سپلائی کرے گا۔ ادھر ٹی ہاؤس میں سی آئی اے کا بہت چرچا تھا۔ باری باری کتنے ادیبوں' دانشوروں کا چال چلن مشکوک ٹھہرا تھا۔ کتنے سی آئی اے کے ایجنٹ قرار دیئے جا چکے تھے۔ لگتا تھا کہ امریکہ اس شہر کے سارے ادیبوں کو خاص طور پر ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والوں کو خریدنے پہ تلا بیٹھا ہے۔ اور میں ایک تو میں نخالص قسم کا رجعت پسند' پھر یو ایس آئی ایس میں کئی کام کرنے والوں سے یاد اللہ۔ ایک تھے پیر احمد شجاع' شیخ صاحب اور ناصر سے ان کی گہری دوستی تھی۔ اسی واسطے سے یاد اللہ مجھ سے بھی تھی۔ یو ایس آئی ایس لائبریری کے انچارج تھے۔ کتابوں میں غرق رہتے تھے۔ سیدھی سادھی نوکری کرتے تھے۔ سیاست سے بے تعلق تھے۔ نہ شاید انہیں یہ احساس تھا کہ اس زمانے میں ادب بھی سیاست کی زد میں ہے۔ امریکہ سے جو ادیب آتے وہ ان کے ذمے پڑتے۔ اور وہ فوراً ناصر اور مجھے بلا کر ان سے ملاقات کراتے۔ اور اس وقت میں حلقہ کا سیکرٹری تھا۔ اور ایک ادبی رسالہ کا مدیر۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس شاعر کو حلقہ میں بلاؤ۔ کسی خصوصی نشست کا اہتمام کرو۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ایسی نشست تو ممکن نہیں کہ حلقہ کی ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ ہاں یوں ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے مہمان کو لے کر حلقہ میں آئیں۔ وہ مہمان دیکھے کہ یہاں ادبی محفل کس طرح برپا ہوتی ہے' کس طرح بحث مباحثہ ہوتا ہے۔ حلقہ کے بعد ہم ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے ہیں۔ اس چائے کو ہم ایک رسمی شکل دے دیں گے کہ وہ مہمان شاعر کے اعزاز میں چائے کی تقریب بن جائے۔ وہاں شاعر کے ساتھ تبادلہ خیال ہو۔

اس تجویز پر اتفاق رائے ہوگیا' مگر یاروں کو اس کا پتا چلا تو غل مچ گیا۔ سی آئی اے' سی آئی اے' سب سے زیادہ غل حبیب جالب نے مچایا۔ میں نے حبیب جالب کو سمجھایا اور پیش کش کی کہ تم ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو اور جو کہنا چاہتے ہو کہو۔

حبیب جالب رضامند ہوگیا۔ چائے میں شریک ہوا۔ بات کہنے اور سوال کرنے کے بہانے ایک اچھی خاصی تقریر کر ڈالی اور ظالم نے ایک ایسا فقرہ کہا کہ دوسرے دن اخباروں میں خبر کی سرخی بن گیا۔ کہا کہ امریکہ عجب ہے' ہتھیار ہندوستان کو فراہم کرتا ہے' ہماری طرف خالی شاعر بھیج دیتا ہے۔

حبیب جالب تقریر کر کے اور اپنی تقریر کو اخباروں میں نمایاں دیکھ کر مطمئن ہوگیا۔ ادھر میں مطمئن کہ حق مہمان نوازی بھی ادا ہوگیا اور کھری کھری باتیں بھی ہوگئیں۔ مگر ایک فریضہ احمد مشتاق کو بھی تو ادا کرنا تھا۔ مشتاق ہمارا دوست بھی تھا اور ہمارا محتسب بھی۔ بس یوں سمجھئے کہ نقاد اور محتسب کے لیے ہم غیروں کے محتاج نہیں تھے۔ اس معاملہ میں ہم خود کفیل تھے۔ منڈلی کے اندر ہی یہ فریضہ ادا کرنے والے موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر مشتاق تھا جو خاص طور پر میرے اور ناصر کے چال چلن پر نظر رکھتا تھا۔ اسے مستقل فکر رہتی تھی کہ اس کے یہ دو سادہ دوست شیطانوں کے بہکاوے میں آجائیں گے اور ادارہ ہو جائیں گے۔

تو لیجئے ہفتے کے اندر اندر مشتاق نے آکر یاروں کو خبر سنائی کہ انتظار کا معاملہ طے ہوگیا۔ وہ امریکہ جا رہا ہے۔ اچھا سکوپ تھا۔ مگر ایک چوک ہوگئی۔ مشتاق نے روانگی کی تاریخ مقرر کر دی اور میعاد بھی مختصر ہی رکھی۔ یہی کوئی ایک مہینے کی۔ ایک مہینہ گزرنے میں کتنی دیر لگتی ہے' مقررہ تاریخ آئی اور گزر گئی۔

اس کے بعد میں پیر صاحب کے پاس گیا ''پیر صاحب' شاید آپ نے مشتاق سے کچھ کہا تھا جس سے اس نے اپنی خبر بنائی اور ٹی ہاؤس میں پھیلائی۔''

''پیر صاحب' آپ کمال ہیں' ہمیں امریکہ بھجوائے بغیر ہی ہماری تھڑی تھڑی کرادی۔''

''بھئی' ہم نے تو اپنی طرف سے پروگرام بنالیا تھا مگر ''مدعی ست گواہ چست'' والا مضمون ہوگیا۔''